R-No-2186/57 REGD-NO:L-922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۰ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۸ - شمارہ ۱۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ مئی ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی یاد میں

ذاکر صاحب کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا نہیں۔ ذاکر صاحب زندہ رہیں گے اور انھیں کوئی ہم سے جدا نہیں کر سکتا۔ تین مئی کی دوپہر کو ریڈیو سے یہ خبر ملی کہ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک گیارہ بج کر بیس منٹ پر ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ سنیچر کا ہے۔ اس سے پہلے اتوار کو وہ ناگالینڈ کے دورے سے واپس آئے تھے۔ فروری میں غالب صدی کی تقریبات میں جب انھیں دیکھا تھا تو زکام اور کھانسی کی وجہ سے آواز بھاری تھی اور ان کی صحت کچھ گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، مگر چونکہ ان کی دیکھ بھال برابر ہوتی رہتی تھی اور دوا اور احتیاط کا سلسلہ جاری تھا اس لئے کوئی تشویش نہ تھی۔ تین مئی کی صبح کو وہ معمول کے مطابق بیدار ہوئے نماز پڑھی اخبار دیکھے اور اپنا کام کیا۔ گیارہ بجے ان کا ڈاکٹر ان کا روزمرہ کا معائنہ کرنا چاہتا تھا اور چونکہ گلا کچھ خراب تھا اس لئے ایکسرے بھی لینا چاہتا تھا۔ قبل اس کے کہ معائنہ شروع ہو وہ غسل خانے میں گئے۔ جب وہاں سے نکلنے میں دیر ہوئی تو جانثار خادم اسحاق کو وحشت ہونے لگی۔ غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ ایک دوسرے دروازہ سے اندر گیا تو دیکھا کہ وہ فرش پر پڑے ہیں۔ اس نے گھبرا کر ڈاکٹروں کو آواز دی۔ انھوں نے دیکھا تو قلب کی حرکت بند تھی۔ اس وقت انھوں نے دل کو حرکت میں لانے کے لئے تمام ممکن تدابیر کیں مگر کوئی پیش نہ گئی۔ ذاکر صاحب گیارہ بج کر بیس منٹ پر اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے تھے۔

ذاکر صاحب نے بہتر برس کی عمر پائی۔ اسی فروری میں ان کی بہترویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ فروری کا مہینہ مرحوم ان کی پیدائش کا مہینہ تھا مگر اپنی تاریخ پیدائش انھیں معلوم نہ تھی۔ لوگوں نے ایک دن مان لیا تھا۔ کچھ دن کم دو سال پہلے انھوں نے صدر جمہوریہ کے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس منصب جلیلہ پر وہ دو سال سے بھی کم مدت فائز رہے۔ مگر صدر جمہوریہ تو وہ اب ہوئے، ملک و قوم کے محبوب تو برسوں سے تھے۔ اندرا گاندھی نے درست کہا کہ "انھیں صدر اس وجہ سے منتخب نہیں کیا گیا تھا کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے یا پیدائش کی وجہ سے مسلمان تھے۔ انھیں ہندوستان کا پہلا شہری اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ ملک کے سب سے ممتاز شہری تھے۔" کسی مذہب کا ماننے والا ہو، کسی سیاسی پارٹی کا فرد ہو، کسی علاقے کا رہنے والا ہو، اب تو سبھی اس بات پر متفق تھے کہ ذاکر صاحب کی صدارت سے اس مسند کو زینت تھی۔ سبھی کو احساس تھا کہ ایسی علمی قابلیت، ذہنی صلاحیت، اعلیٰ کردار، وسعت قلب، تہذیب، وضعداری، انسانیت، شرافت، خلوص اور محبت کا مجموعہ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب قائم گنج کے پٹھانوں کے ایک ممتاز خاندان سے تھے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اٹاوہ کے اسکول میں اور پھر ایم۔ او۔ کالج میں تعلیم پائی۔ اٹاوے کے اسکول میں ان کا یہ حال تھا کہ بلقان کی لڑائی کی خبریں معلوم کرنے ریلوے اسٹیشن اخبار لینے جایا کرتے تھے اور مسجدوں میں ترکیوں کے لئے چندے کی اپیل کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی ان کی خطابت اور قیادت کے جوہر نمایاں ہو چلے تھے۔ لوگوں سے کہتے تھے کہ آپ جو پیسے دیں گے ان کی گولیاں بنائی جائیں گی اور یہ گولیاں دشمنوں کے سینوں کے پار ہوں گی۔ علی گڑھ آئے تو ان کی ذہانت کے جوہر اور کھلے۔ وہ کلاس میں کم نظر آتے تھے، لائبریری میں زیادہ۔ حاضریاں کم رہتی تھیں مگر درجے میں اوّل آتے تھے۔ ان کے ساتھی حبیب الرحمٰن مرحوم کا بیان تھا کہ بی اے کے امتحان کے لئے ذاکر صاحب نے مطالعہ بہت کم کیا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے خوب تیاری کی تھی اور بڑے جامع نوٹ تیار کئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے وہ نوٹ دیکھنے کو مانگ لئے۔ انھوں نے رحم کھا کر دے دئے

نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کالج میں اوّل آئے، حبیب الرحمٰن تیسرے نمبر پر۔ یونین کے نائب صدر کی حیثیت سے وہ طلبہ کے مستند لیڈر تھے۔ جب ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی اور گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد علی گڑھ آئے تو شروع میں ذاکر صاحب خاموش تھے، مگر ایک تقریر نے انھیں اس درجہ متاثر کیا کہ وہ کالج کو چھوڑ کر جامعہ جانے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ یہ جذباتی طوفان بہت سے لوگوں کے دلوں میں آیا تھا۔ جب سکون ہوا تو یہ لوگ واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب اور ان کے چند ساتھی ڈٹے رہے۔ مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے۔ "قانونِ باغبانیِ صحرا" لکھتے رہے۔ عشق کی وادی میں قدم رکھا تو پھر منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

جامعہ سے ہی وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے۔ وہاں نہ صرف پروفیسر زومبارٹ کی نگرانی میں اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کیا، بلکہ جرمنی میں مقیم ہندوستانی طالب علموں سے رابطہ پیدا کیا۔ یہیں انھیں عابد حسین اور محمد مجیب جیسے ساتھی ملے۔ یہیں انھوں نے دیوانِ غالب کا برلن ایڈیشن شائع کیا جس کے کچھ اوراق کے لئے انھوں نے ٹائپ خود کمپوز کیا۔ جرمنی ہی میں انھیں یہ خبریں مل گئی تھیں کہ وہ قومی رہنما جنھوں نے جامعہ قائم کی تھی، اب مشکلات سے گھبرا کر اسے بند کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے لکھا تھا کہ یہ فیصلہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک وہ واپس نہ آ جائیں۔ اپنی واپسی پر انھوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا، ان سے بیس برس خدمت کرنے کا عہد لیا اور ان سب کی طرف سے جامعہ کے چلانے کی ذمہ داری لی، چنانچہ جامعہ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے سپرد کر دی گئی۔ اس قومی ادارے کو ذاکر صاحب نے وقتی سیاست سے الگ رکھا مگر حقیقی سیاست پر ان کی نظر رہی۔ یہ ایک ایسا قومی ادارہ تھا جس میں قومی یک جہتی، آزادی کی جد و جہد، برطانوی سامراج سے بیزاری، قومی تعلیم، مشرقیت، مذہبی ماحول، جدید تصورات، تصنیف و تالیف، سبھی کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ قرول باغ کے کرائے کے مکانوں میں تھی۔ ذاکر صاحب نے اوکھلے میں زمین حاصل کی، جامعہ کی عمارتوں کا نقشہ بنایا، ہمدردانِ جامعہ کا ایک حلقہ قائم کیا۔ ملک بھر کے دورے کئے، سرکاری امداد کی طرف قطعاً توجہ نہ کی مگر عوام اور اہلِ خیر حضرات سے برابر اپیل کرتے رہے۔ بچوں کا ایک اچھا مدرسہ چلایا جس میں اخلاق کے سدھار، پابندیِ اوقات، اچھی تنظیم، قومی تصور پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ رسالہ جامعہ کے ذریعہ سے سماجی علوم اور ادبیات پر اچھے مضامین لکھوائے۔ مکتبہ جامعہ کے ذریعہ سے اچھی اور معیاری کتابیں شائع کیں۔ مخلص اور محنتی کارکنوں کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا اور یہ سب ایسے حالات میں کیا کہ مالی وسائل بہت کم تھے۔ تنگی ترشی سے گزر ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب ابتدائی اسکول کے بچوں کو کبھی کبھار درس بھی دیتے تھے۔ کالج میں اور ثانوی مدرسے میں بھی کبھی کبھار پڑھاتے تھے۔ جامعہ کے کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ ملک کا دورہ بھی کرتے تھے۔ دنیا بھر کے سربراہوں سے ملتے بھی تھے، گپ بھی کرتے تھے۔ دوستوں کی دعوتوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ ان کی ہر چیز میں ایک سادگی اور نفاست۔ ان کی ہر بات میں حکیمانہ نکتہ سنجی اور شاعرانہ شوخی برابر ملتی تھی۔ علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ کو اپنایا تھا۔ اس وقت علی گڑھ جن خطوط پر چل رہا تھا ان سے اتفاق نہ کرتے تھے۔ مگر علی گڑھ آتے یہاں کے علمی کاموں میں شریک ہوتے، ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق گفتگو کرتے۔ ہم جیسے نوجوانوں کے ذہن میں روشنی کرتے اور دل میں کوئی چنگاری روشن کرتے۔ ہم میں سے ہر ایک یہ کہتا کہ شاید ہم سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے۔ میری زندگی کے کئی اہم فیصلے ذاکر صاحب کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ ان پر آج تک مجھے افسوس نہیں ہے، بلکہ فخر ہے۔　　(باقی آئندہ)

صدر جمہوریہ ہند کی وفات پر سکریٹری انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا پیغام تعزیت

نانپارہ: صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی اچانک وفات ہمارے لئے ایک عظیم سانحہ اور ملک کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ذاکر صاحب کے انتقال سے ہم ایک ایسی عہد آفریں شخصیت سے محروم ہو گئے جس کی دلآویزی، رنگارنگی اور کشش نے نہ صرف ایک عہد اور ایک نسل کو متاثر کیا ہے بلکہ پورے ملک اور دنیا نے بھی اس سے فیضان حاصل کیا ہے۔ مرحوم دانشور نے اردو زبان و ادب پر جو احسانات کئے ہیں اب اس کو فراموش کرنا اردو کے شیدائی کے لئے ناممکن ہے۔ وہ بہترین ادیب، مشفق معلم اور ایسے قومی رہنما تھے جو اردو کے گوناگوں مسائل سے غافل نہ تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک خط میں وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔　　(راحت علی خاں جنرل سکریٹری)

ڈاکٹر وزیر آغا کا دوسرا شعری مجموعہ شایع ہو گیا

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر جناب وزیر آغا کا دوسرا شعری مجموعہ "دن کا زرد پہاڑ" شائع ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ میں وزیر آغا کی نئی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ۱۰۴ صفحات کے اس مجموعے کی قیمت ۳ روپے ہے۔ اسے جدید ناشرین چوک اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔ (نامہ نگار)

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔　　(ادارہ)

اصغر عباس

گزٹ کے آئینے میں

سرسید کی شخصیت کے چند پہلو

انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت شاندار ہے کہ اس صدی میں یہاں سے بہت سے نامور مصلح ادیب شاعر مورخ انشاپرداز اور صحافی پیدا ہوئے لیکن ان سب کی خصوصیات اگر کسی ایک شخصیت میں سمٹ کر مزید آب و تاب سے جلوہ گر ہوئیں تو وہ ذات صرف سرسید کی تھی۔

ادبی لحاظ سے سرسید کی شخصیت کو ہم کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن ان سب میں سرسید کی صحافتی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں اور ان کی زندگی کے بڑے حصے کا احاطہ کرتی ہے۔ سرسید کو بیس برس کی عمر میں سید الاخبار میں کام کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ پھر جب بہادر شاہ کی حکومت کا بیسواں سال شروع ہوا اور سرسید کی قوم پر بُرا وقت پڑا تو انھوں نے حالات کے انتشار کو کم کرنے کے لئے مراد آباد ۱۸۶۰ء میں رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا کا اجرا کیا۔ رسالے کے صرف تین نمبر نکل سکے۔ اس رسالہ میں ان مسلمانوں کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا تھا۔ اس تذکرہ کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسے آجکل بعض اخبارات میں مسلم مجاہدین آزادی کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے۔

لیکن حالات کی سختی اس کے باوجود کم نہ ہوئی اور سرسید کے دل میں قوم و ملک کی زبوں حالی کا احساس شدید ہوتا گیا۔ سرسید کا سابقہ ایک ایسی قوم سے تھا جو قرون وسطیٰ کے اندھیرے میں گرفتار تھی جدید خیالات کی مخالف تھی جو اوہام پرستی اور جہالت کا شکار تھی اس صورت حال سے نجات دلانے کے لئے سرسید نے صحافت کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور انھوں نے ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار سین ٹیفک سوسیٹی کا اجرا کیا جو بعد میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انگریزی اور اردو دونوں میں مضامین اور خبریں ہوتی تھیں سولہ صفحے کے اس ہفتہ وار میں ملکی غیر ملکی مستند اہم اور کارآمد خبروں کے علاوہ ملک کے سیاسی تعلیمی اور سماجی حالات پر اداریے بھی ہوتے تھے اور جو خبریں تعلیم و تعلم سے متعلق ہوتی تھیں انھیں اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا۔ مذہبی بحثوں سے اس اخبار نے ہمیشہ احتراز کیا اور بقول مولانا حالی "انھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کئے ان میں تمام ہندوؤں مسلمانوں کو شریک کیا سوسائٹی کے اخبار میں جو تیس برس ان کے ہاتھ میں رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو ہمیشہ ہندو لیڈروں اور رفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں کیا" اس اخبار کے مخاطب ہندو مسلمان اور انگریز ہوتے تھے گویا ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کی ہندوستان میں سب سے پہلی کوشش کا آغاز سرسید کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس اخبار کی پابندی اوقات کا عالم یہ تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا "اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہو گا جو اپنی مقررہ تاریخ پر نکلا ہو" اس زمانے کے اخبارات کے لئے یہ بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل تھی۔

اخبار سین ٹیفک سوسیٹی کا جب پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس میں اخبار کے مقاصد بھی درج تھے ان مقاصد کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً فرد اور جماعت کے اخلاق کی اصلاح تہذیب و شائستگی قومی عزت کا احساس پیدا کرنا ہندوستانیوں کو سائنسی انداز فکر اور جمہوری طریقۂ حکومت سے آشنا کرانا اردو زبان کو قومی اور اجتماعی افکار و احساس کا ترجمان بنانا یہی وہ خاکے ہیں جن میں رنگ بھرنے کی کوشش گزٹ کے ہر شمارے میں کی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس

سلام مچھلی شہری

غزل

تا چند نازِ ساقیٔ مے خانہ کھینچیے
اب کوثرِ خیال سے پیمانہ کھینچیے

ٹوٹے نہیں ہیں آج بھی آئینہ ہائے دل
جو نقش چاہیے وہ نگارانہ کھینچیے

قابو میں یوں نہ آئے گا طوفانِ تند دل
کاغذ کی ناؤ ہے اسے عاقلانہ کھینچیے

یہ خامشی علامتِ طوفاں کہیں نہ ہو
زنجیر پائے وحشتِ دیوانہ کھینچیے

مارے ہوئے ہیں آپ رفیقوں کے اے سلام
بہتر یہی ہے منتِ بیگانہ کھینچیے

اخبار میں ایک اور تصویر بھی برابر طبع ہوتی ہے اور وہ ہے خود صاحب اخبار کی جیتی جاگتی تصویر، کیونکہ شذروں کے انتخاب سے کسی شخصیت کی تصویر کشی ہو یا نہ ہو لیکن خبروں اور اداریوں کے موضوعات کے انتخاب سے یقیناً ایک صحافی کی شخصیت کی تصویر کشی ہو سکتی ہے۔

گزٹ کے مطالعے سے سرسید کی شخصیت کا ایک وصف یہ سامنے آتا ہے کہ انھوں نے سچائی اور دیانت کو خبروں اور اداریوں میں ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ انھوں نے اسے اپنی اولین ذمہ داری بھی کہ وہ عوام کو صحیح حالات وواقعات سے آگاہ کریں اور راستبازی کو نہ صرف انفرادی زندگی میں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی نظر انداز نہ کریں۔ یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے حق گوئی کی راہ اس وقت اپنائی تھی جب کہ کسی انگریز افسر کی نگاہ گرم گزٹ کو جلا دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھی لیکن سرسید کے کردار کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ سچ بات کہنے سے کہیں بھی گریزاں نہ ہوتے تھے چاہے وہ علماء کا حلقہ ہو وائسرائے کا دربار ہو یا کونسل کا اجلاس۔ صحافیوں کو راستبازی کی راہ اپنانے کی تلقین کرتے ہوئے سرسید ایک اداریہ میں لکھتے ہیں۔

"اخبار نویسی بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور اخبار نویس کی راستبازی اور آزادہ روشی کی بڑی شان ہے پس اخبار نویس پر فرض ہے کہ وہ اپنے شان کے خلاف معاملات پر نظر رکھے اور راستبازی کے خلاف نہ کرے۔"

گزٹ کی ادارت کے دوران جب بھی حق گوئی کا موقع آیا انھوں نے ہمیشہ حالات کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرتے ہوئے سچائی کی راہ اپنائی چنانچہ جب مانچسٹر کے تاجروں نے مطالبہ کیا کہ ان کے کپڑے پر ہندوستان میں درآمد پر ڈیوٹی نہ لی جائے تو سرسید نے کھل کر لکھا کہ

"ہندوستان کی دولت انگلستان کو کھنچی چلی جاتی ہے اور کل کے بنے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کے ٹکڑے بہت جلد سونا اور چاندی ہوئے جاتے ہیں مگر مانچسٹر والے روپیہ کو اس طرح پر کھنچے چلے جانے سے راضی نہیں ہیں بلکہ وہ حتی الامکان اس سے بھی زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کو اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہیں ہے کہ ہندوستان دولت مند ہے یا غریب"

سرسید نے جب ہندوستانیوں کو قرون وسطیٰ کے جال سے نکالنے اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے منصوبہ کا آغاز کیا تو ان کی مخالفت کا طوفان روز بروز شدید اور تیز تر ہوتا گیا۔ یہ منصوبہ پنج سالہ منصوبہ نہیں تھا اور یہ مخالفت وقتی نہیں تھی بلکہ ان دونوں کی کشمکش ان کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہی۔ اور سرسید اس سلسلہ کی ساری تکلیفیں پامردی اور صبر وتحمل سے برداشت کرتے رہے

لیکن اس کے باوجود گزٹ میں ان کی زبان قلم سے کوئی ایسی تحریر نہ نکلی جسے یہ کہا جا سکے کہ یہ انتقاماً ہے۔ یہاں تک کہ اگر دوسرے اخبارات ان کی حمایت میں کچھ لکھتے تو انھیں بھی روک دیتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہوا جس کا کوئی نہ کوئی مخالف نہ ہوا ہو پس جس شخص کی مخالفت میں لوگ ہیں اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ کام نہیں ہے کہ مخالفوں کی باتوں کا جواب دیتے پھریں اور بے فائدہ اور عمل کام میں اپنا وقت ضائع کریں بلکہ اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ فرض ہے کہ مخالفوں کی گفتگو کو سنیں اور ان کی تحریروں کو خوشی سے پڑھیں اور نہایت سچائی سے غور کریں کہ حقیقت میں وہ عیب و نقصان اس میں ہیں جو اس کے مخالفوں نے نکالے ہیں یا نہیں۔ اگر ہوں تو ان مخالفوں کا شکر کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنی مہربانی سے اس عیب سے مطلع کیا اور اگر نہ ہوں تو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ وہ عیب جو مخالف لگاتے ہیں اس میں یا ان کے دوست میں نہیں ہیں اور کسی بدووقدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانے میں از خود مثل جھوٹے مول کی آب کے بے آب ہو جاوے گی خواہ وہ بات خود اس شخص کی ہو خواہ اس کے مخالف کی۔"

جمہور علماء نے سرسید کی مخالفت کی۔ جمال الدین افغانی نے سرسید کو جو کچھ کہا یہاں تک کہ مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے سرسید کو کفر کا فتویٰ دیا۔ لیکن گزٹ میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں تھا بلکہ جب مولانا محمد قاسم صاحب کا وصال ہوا تو گزٹ میں اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے سرسید نے لکھا

"زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم اور فضل اور تقویٰ میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق خاں کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی نیکی اور

دین داری اور تقویٰ اور مسکینی سے ثابت کر دیا
کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی
محمد اسحٰق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے
بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔"

پورے اداریے میں کہیں بھی اس کا اشارہ تک موجود نہیں ہے کہ مولانا مرحوم نے سرسید کی دعوت پر مدرسۃ العلوم کے دینیات کا نصاب بنانے سے انکار کر دیا تھا یا سرسید کو باقاعدہ کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید تحمل و برداشت کے ایک بے مثال پیکر تھے۔

سرسید کے بارے میں جہاں بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں وہیں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ پرست تھے یہ صحیح ہے کہ جن حالات میں سرسید نے اپنے اصلاحی کاموں کا آغاز کیا تھا ان میں خاص اہمیت مسلمانوں کی آباد کاری کو دی گئی تھی لیکن اس سے یہ کہاں واضح ہوتا ہے کہ وہ فرقہ پرست تھے سرسید کے کارناموں کا ان حالات میں جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مصلح ہیں جنھوں نے سب سے پہلے بغیر کسی تفریق کے ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی گزٹ کے ذریعہ کوشش کی چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوستی کی شدید خواہش کا اظہار گزٹ میں برابر ملتا ہے۔

"پس یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے
ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں دوستی اور
برادری اور محبت روز بروز بڑھتی جاوے
اور سوشل حالت میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز
مسجد والے کے اور ہندو بجز مندر والے کے پہچانے
نہ جائیں۔"

گزٹ کے ایک اداریہ میں لکھتے ہیں

"اگر کوئی مذہب سچ ہے اور اس کے معتقد اس
کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو ان کو یقین کرنا
چاہیے کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور
ہمدردی پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے
پس اگر اس فرض کو ہم ہمیشہ خیال میں رکھیں تو
کسی مذہب سے انسان کے دل میں بغض و حسد
و کینہ پیدا نہیں ہو سکتا ہمارا تو یہی یقین ہے اور
اسی پر برتاؤ ہے۔"

سرسید کی اس رواداری کی عملی شکل ہمیں مدرسۃ العلوم مسلمانان میں ابتدا ہی میں ملتی ہے ہندو اساتذہ اور طلبہ کی ایک معتدبہ تعداد کے علاوہ سرسید ہندو طلبہ کی ہمت افزائی بھی کرتے رہتے تھے گزٹ کی ایک اطلاع یہ بھی ملاحظہ ہو۔

"محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے بی اے کلاس
کے ہندو طالب علموں کو اطلاع دی جاتی ہے
کہ جو ہندو طالب علم اگلے امتحان بی اے میں فرسٹ
ڈویژن میں پاس ہوگا اس کو سرسید احمد خاں اپنے
پاس سے ایک طلائی تمغہ انعام میں دیں گے۔"

سرسید کی ملک و قوم کی عظیم خدمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نام و نمود سے وہ کتنے گریزاں رہتے تھے تو صالحان سلف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مدرسۃ العلوم کو جب ان کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز ان کے سامنے پیش کی گئی تو سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی۔ حاجی محمد اسمٰعیل رئیس دتاولی اور دوسرے بزرگوں نے جب مدرسۃ العلوم کا دروازہ ان کی یادگار کے طور پر بنانے کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے چندہ کا اعلان کیا تو چندہ کی فراہمی تک وہ خاموش رہے لیکن جب دروازہ تیار ہوا اور ان کے نام کا کتبہ لگائے جانے کی تیاری ہوئی تو سرسید نے مخالفت کی اور کہا کہ دروازہ پر یہ لکھا جائے کہ

"قوم نے اپنی بہتری کے لئے خود اپنی کوشش
سے یہ مدرسۃ العلوم بنایا ہے"

نام و نمائش سے یہ احتراز صرف مدرسۃ العلوم تک محدود نہ تھا بلکہ جب مولوی سراج الدین نے سرسید کی سوانح حیات لکھ کر پیش کی تو صرف اس لئے اس کو ناپسند کیا کہ وہ ان کے کارناموں کی مداحی تھی۔ گزٹ میں بھی انھوں نے کبھی اپنی تعریف میں کوئی مضمون شائع نہ کیا مدحیہ مضامین وہ واپس کر دیا کرتے تھے وہ اس سلسلہ میں یہاں تک محتاط تھے کہ اگر دوسرے اخبارات بھی ان کی تعریف میں کچھ لکھتے تو انھیں روک دیا کرتے تھے۔

عام خیال تو یہ ہے کہ گزٹ تک ہماری صحافت نے ترقی کے کئی مراحل طے کئے ہیں لیکن صحافتی دیانت و راست بازی اور حق گوئی کی جیسی مثال گزٹ سے ملتی ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے نہیں بلکہ انیسویں صدی کی سیاست اور معاشرت کو سمجھنے کے سلسلے میں گزٹ میں جو مستند مواد ملتا ہے اس کا متبادل کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں نیز سرسید کے کردار اور ان کی شخصیت کے بارے میں جو بے بنیاد نظریات قائم کئے گئے ہیں ان کی بھی تردید ہوتی ہے اور یہ شدید احساس ہوتا ہے کہ سرسید کی شخصیت کے بارے میں ہم کو ابھی تک مکمل معلومات نہیں ہیں۔ سرسید کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ

(باقی صفحہ ۷ کالم ۲ پر)

نجم الحسن نجم ادیب

میسور کی بازاری اردو کے کچھ الفاظ

اس عنوان کے تحت کچھ دنوں پہلے ہماری زبان کے صفحات پر ایک مضمون لکھ چکا ہوں حوالے کے لئے ملاحظہ فرمایئے (ہماری زبان مورخہ ۱۵ اپریل ۹۹ء)

"درماہہ" جو فارسی لفظ درہم سے نکلا ہے یہاں کی بازاری اردو میں تنخواہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔

"بجڑ" یہ لفظ کنڑا لفظ ಬಹಳ (BAHLA) کا مترادف ہے اور بازاری اردو میں "بہت" کے معنوں میں مستعمل ہے۔

"ٹکنا" یہ لفظ تو یہاں روزمرہ میں "رکنا" کے معنوں میں مستعمل ہے مگر جان دار چیزوں کے استعمال میں صحیح نہیں ہے جیسے وہ چلتا چلتا ٹک گیا۔ یہاں چلتا چلتا رک گیا یا ٹھہر گیا لکھنا چاہیے کیونکہ برتن یا دیئے کے لئے لفظ صحیح ہوگا جیسے برتن کو زمین پر گھمائیں تو وہ گھومتے گھومتے ٹک جائے گا۔

"ردبرد" سے مراد ہے چہرہ بچہرہ مگر یہاں اکثر نماز کی صفوں میں لوگ یوں استعمال کرتے ہیں "ردبرد کی صفیں والے صفیں برابر کرلیجئے" مگر وہ غلط مستعمل ہے۔

"دادا بھائی" یہاں بڑے بھائی کو مخاطب کرتے ہیں دراصل دادا باپ کے باپ کو کہتے ہیں مگر بنگالی زبان میں "دادا" کے معنی بڑے کے ہیں۔ اسی لئے یہ لفظ یہاں کی بازاری اردو میں بھی "بڑے" کے معنوں میں مستعمل ہے۔

اب میں یہاں چند الفاظ درج کرتا ہوں جو عام طور پر میسور کی بازاری اردو میں مستعمل ہیں۔

السی = سست
دست سگٹ = منظم
اپرداپا = تعجب
آگی = ضعیف
بھنو = آبرو
سپلک = چھپکلی
اتو = حیف
ہٹ = ضد
دیوڑی = آنگن
دوستی = نسبت
عارس = دلہن
نوشو = دولہا
انکھیاں = آنکھیں
دسنا = دکھائی دینا
چونڈی = نالہ
پاؤں = پیر
غلاٹا = گڑبڑ
پلو = دامن
تلوف = تالا
کھرواڑہ = گھروندہ
دلندر = منحوس
چکلاٹ = تنگی
موچنا = بندکرنا
دوغر = درگاہ
بجید = مسجد
چنی = چراغ
گدل = چمگادڑ
مچی = مچھلی
لوہونا = عاشق ہونا
کھتوہونا = شرمندہ ہونا
بڑا آسامی = مالدار
ننگا سنگا = برہنہ
جگے بھگے = جلدی جلدی
کبر = کمر
ببتی = ناف
کنبا = تیلہ
کاپور = کافور
کبل = مشکل
کان کرونی = کان صاف کرنے کا آلہ
کاڑنا = نکالنا
کاریس تانی = کاریگری

انیس انصاری

جانب منزل چلے ہم

میری ندیم! تو مجھ سے ہی میرا حال نہ پوچھ
ہزار راستۂ درد سامنے ہیں ابھی
ہزار لشکر رہزن، ہزار جوئے خضر
سبھی سے بچ کے نکلنا ہے جانب منزل
نہ درد ہجر کی باتیں، نہ شکوۂ بیداد
نہ بے وفائی کا ماتم، نہ رحم کی فریاد
مجھے کسی بھی سہارے کی کیوں ضرورت ہو؟
مجھے یقیں ہے سنو گی تو خوش بہت ہوگی
کہ خود پکارا ہے منزل نے میرے قدموں کو

مجھے بس ایک قدم اور آگے جانا ہے
بلا رہی ہے میری منزل مقصود
ہزار راستۂ درد چل کے آیا ہوں
دعا کرو کہ میں ثابت قدم پہنچ جاؤں

غپ چپ = خاموشی
سوماری = سست
سٹکنا = سرکنا
سپڑنا = گرفتار ہونا
رانڈ = بیوہ
رکشس = دیو
ڈھگار = انبار
ڈھال = ڈالی
ڈرنی = کشتی
دھنڈلات = ادھر ادھر پھرنا
چاڑی = چغلی
چھبار = چھار
چھورا = چھوکرا
چھینکنا = چھڑکنا
پھسلی = پسلی
پھوٹیارا = تہ خانہ
بھیکاری = فقیر
گوڈا = گھٹنا
کلا = رخسار
بھاڑا = کرایہ
جھاڑ = درخت
کندھا = بازو
ماڑی = بالاخانہ
ٹوال = تولیہ
کنڈم = نالائق

تباو = دبا
دلبندرائی = نحوست
پول = آل اولاد
بانگرو = عورت

چند محاورے جو بازاری اردو میں مستعمل ہیں۔

ہاتھ دینا = دھوکا دینا
خوب جھاڑنا = شرمندہ کرنا
حرامی ذولا = بدطینت شخص
جورو = بیگم
منگوس = نیولا
گھانٹی = گانٹھ
فقر = فجر
دوفار = دوپہر
بھٹیرے = ٹماٹر
پھوٹ = خربوزہ
کھنگوا = تربوز
بیری = ترجل
پیپل کے جھاڑ = برگد کے درخت
جھجھو = گہوارا
اوس = شبنم
دھوپ کالا = موسم گرما
ٹھنڈ کالا = موسم سرما

باقی صفحہ ۵ سے آگے

"ان کے پاک اور بلند شخصی کیریکٹر پر حرف گیری صرف وہی کرے گا جو حقیقت سے چشم پوشی کرے۔ ان کے واقعات زندگی دیکھیں تو خیال آتا ہے کہ یہ مومنانہ سیرت یہ بے ریائی ایسے خلوص اور جرأت اسی خوش نصیب کو میسر ہو سکتی تھی جو نقشبند دقت شاہ غلام علی کی گود میں کھیلا کودا تھا جس نے شاہ ولی اللہ کے پوتوں اور فرزندان ارجمند سے فیض حاصل کیا تھا جو فقط ایک وزیر سلطنت کا نواسہ اور ہماری انتظامی اور سیاسی روایات کا وارث نہ تھا بلکہ جس نے مدتوں ہمارے بہترین روحانی سرچشموں سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔"

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔



مراسلات

دیوانِ غالب کے خود نوشتہ نسخے کے سلسلے میں

(۱)

۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں دیوانِ غالب کے خود نوشتہ نسخے کی دریافت کے سلسلے میں جناب نثار احمد فاروقی صاحب کا مراسلہ نظر سے گذرا۔ غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کی جتنی قدر مرنے کے بعد ہوئی اس کا علم ہم سب کو ہے اس کے غیر مطبوعہ اور خود نوشتہ کلام کی دریافت غالب پرستوں کے لئے خوشی کی چیز ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ مخطوطہ واقعی اصلی ہے؟ اگر ایسا ہے تو بھی مولانا امتیاز علی عرشی صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر مختار الدین صاحب کی رائیں لینا بہت ضروری ہے کسی ایک ماہر غالبیات کی رائے کو صحیح سمجھنا بھی بڑی بے انصافی ہوگی۔

اب ذرا امروہے والے توفیق احمد چشتی صاحب کو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ یہ مخطوطہ ان کو کہاں ور کیسے ملا، توفیق صاحب پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی کبھی کبھار مخطوطات اور نادر کتابیں فروخت کرنے آتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں بھی کتابیں سپلائی کرتے ہیں۔ دوسرے نثار احمد فاروقی صاحب کی تصدیق کافی نہیں کیونکہ نثار صاحب بھی امروہے کے قریب کے رہنے والے ہیں۔ مخطوطات کا کاروبار کرنے والے حضرات کاتب سے خوشخط لکھوا کر زمین کے اندر دفن کرا دیتے ہیں اور چند سال کے بعد جب زمین سے تحریریں برآمد ہوتی ہیں تو ان کی شکل پرانے نسخوں جیسی ہو جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ غالب کے کلام کا یہ مخطوطہ کسی تجربہ کار کاتب کا لکھا ہوا ہو اور غالب کی برسی کے موقع پر زمین سے نکالا گیا ہو تاکہ اس کے اچھے دام مل جائیں۔ میرے علم میں بہت سی غالب کی تحریریں ایسی ہیں جن کی نقل غالب کی تحریر کے عین مطابق ہے اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں ہے اس لئے خریدار حضرات سے خصوصاً محترم حکیم عبدالحمید صاحب سے بصد ادب التماس ہے کہ مخطوطے کی قیمت کا تعین سوچ سمجھ کر کریں اور اس کے اصل ہونے کے ثبوت کے لئے ماہرین غالبیات سے رجوع کریں۔ (ذوالفقار اکبرآبادی ایم۔ اے)

(۲)

غالب کے نو دریافت قلمی دیوان کے متعلق محترم جناب نثار احمد فاروقی کی ایک تحریر "ہماری زبان" مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء کے دوسرے صفحہ پر میری نظر سے گذری۔ اس سے قبل پی۔ ٹی۔ آئی۔ کی خبر اور "قومی آواز" لکھنؤ میں یو۔ پی۔ آرکائیوز کے جناب جلال الدین صاحب کے مراسلے کی اشاعت سے بھی اس قلمی دیوان کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا "سیاست جدید" کانپور۔ کی خبر میں یہ اضافہ بھی تھا کہ مولانا امتیاز علی عرشی مدظلہ نے اس قلمی نسخے کے اصل ہونے کی تصدیق فرما دی ہے۔ اب نثار احمد فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

"اس میں نسخۂ حمیدیہ سے بھی پہلے کا کلام ہے یعنی اس مخطوطے کے اشعار کی اصلاح یافتہ شکل نسخۂ حمیدیہ میں ملتی ہے"

یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے اور خدا کرے صحیح ہو لیکن اس قلمی نسخے اور نسخۂ حمیدیہ (نسخۂ بھوپال) کے اختلافات ظاہر کرنے کے لئے جو دو شعر فاروقی صاحب نے پیش کئے ہیں کم از کم ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی شاید موصوف سے یہ مثالیں بڑی عجلت میں اخذ کی ہیں۔ چنانچہ نسخۂ حمیدیہ کی ایک غزل سے جو پہلی مثال انہوں نے دی ہے اس میں مطلعے کا دوسرا مصرعہ پہلے شعر کے پہلے مصرعے کے ساتھ لکھ دیا ہے اور دوسرے مصرعے کی یہی شکل نو دریافت قلمی دیوان میں بھی بتائی ہے۔ ان کے مطابق "نسخۂ حمیدیہ" میں شعر ہے۔

مہ اختر فشاں کی بہر استقبال آنکھوں سے سویدا تابہ لب زنجیری دود سپند آیا

لیکن نسخۂ حمیدیہ میں یہ شعر یوں ہے۔

مہ اختر فشاں کی بہر استقبال آنکھوں سے تماشا کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا

غالباً نو دریافت قلمی دیوان میں بھی دوسرا مصرعہ اسی طرح ہوگا۔ اس سہو سے قطع نظر کر کے فاروقی صاحب کے مطابق نسخۂ حمیدیہ کے برخلاف نو دریافت قلمی نسخے میں پہلا مصرعہ یوں ہے۔

بہ استقبال تمثال زمانہ اختر فشاں شوخی

گزارش ہے کہ پہلے نسخۂ بھوپال میں بھی اس مصرعے کا یہی متن تھا۔ "مہ اختر فشاں کی بہر استقبال آنکھوں سے" بعد میں بنایا گیا تھا۔

اسی طرح مثال کا دوسرا شعر بھی نسخۂ بھوپال کے متن میں پہلے اسی طرح تھا جس طرح فاروقی صاحب نے نو دریافت مخطوطے میں بتایا ہے یعنی

اسد خاک در میخانہ اب سر پر پریشاں کر خوشا وہ دن کہ آب انفعال سے تجدید زانو تھا

چنانچہ ان مثالوں سے نو دریافت قلمی دیوان اور نسخۂ بھوپال (فاروقی صاحب کے مطابق نسخۂ حمیدیہ) کا اولین متن ایک ہی ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ اول الذکر کے اشعار کی اصلاح یافتہ شکل موخر الذکر میں ملتی ہے ہاں نسخۂ بھوپال ہی میں بعد میں ترمیم کی گئی ہے۔ جیسا کہ فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے ضروری تفصیلات کے بغیر کوئی نتیجہ سامنے نہیں قائم کی جا سکتی لیکن ان کی مثالوں سے گمان ہوتا ہے کہ نو دریافت قلمی دیوان میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ کلام ہے جس کو انہوں نے کی کچھ کے بعد خوشنویس سے نسخۂ بھوپال میں لکھوایا تھا شعروں میں اصلاح شاید اس کے بعد نسخۂ بھوپال ہی میں کی گئی تھی۔

بہر حال غالب کے کلام کا یہ اہم ترین مخطوطہ ہے میری تجویز ہے کہ اسے مرکزی نیشنل آرکائیوز کو جلد از جلد خرید کر محفوظ کر لینا چاہئے۔ چونکہ یہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے اس کو منظر عام پر لانے کی سب سے اچھی صورت یہ ہوگی کہ اس کا عکس شائع کر دیا جائے۔ نسخۂ بھوپال (قلمی) کی گمشدگی اور نسخۂ حمیدیہ کی غیر تسلی بخش ترتیب سے جو سبق ملتا ہے اس کے یہی لازمی تقاضے ہیں۔ (ابو محمد سحر)

مدھیہ پردیش شعبۂ اطلاعات میں اردو کو نظر انداز نہ کیا جائے

بھوپال۔ بزم سخن بھوپال کی مجلس عاملہ کے ماہانہ اجلاس میں زیر صدارت جناب نور محمد صاحب قمر ایک تجویز منظور کی گئی جس کا متن یہ ہے بزم سخن کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ گورنمنٹ پبلسٹی کی تنظیم جدید کے سلسلے میں اپنی جانب سے یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس تنظیم جدید میں مدھیہ پردیش کے اردو داں طبقہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہ کی جائے جبکہ دوسرے صوبوں میں جو ہندی کے صوبے کہلاتے ہیں اردو داں طبقہ کو نظر انداز نہیں کیا جاتا جس کی مثال یو۔پی میں ماہنامہ "نیا دور" کی شکل میں موجود ہے اسی طرح بنگال میں جو بنگالی صوبہ کہلاتا ہے شعبہ اطلاعات کی جانب سے پندرہ روزہ "مغربی بنگال" اردو داں طبقہ کی واقفیت کے لئے پابندی سے نکلتا رہتا ہے، ایسی صورت میں مدھیہ پردیش میں شعبہ کی تنظیم جدید کے وقت اس ضرورت کا احساس دلانا ضروری ہے کہ موجودہ گورنمنٹ پبلسٹی مدھیہ پردیش سے بھی ایک ماہانہ یا پندرہ روزہ جریدہ شائع کرے تاکہ صوبہ کی ترقی اور اس کے کاموں سے اردو داں طبقہ بھی واقف رہے اور اپنی حیثیت کے مطابق اس کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکے۔ اردو نیوز بلیٹن کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جائے تاکہ ہندوستان میں اردو اخبارات مدھیہ پردیش کی ترقی کو عوام تک پہنچا سکیں۔

اقبال لائبریری کے زیر اہتمام یوم اقبال پر جلسہ و مشاعرہ

بھوپال۔ حسب روایت سابقہ اس سال بھی اراکین اقبال لائبریری نے ۲۱ ویں یوم اقبال پر جلسہ و مشاعرہ کا اہتمام کیا پہلی نشست کی صدارت پروفیسر اکھلیش کمار جین نے کی جلسہ کا آغاز کرتے ہوئے لائبریری کے سکریٹری نے سامعین کو لائبریری سے متعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال لائبریری بھوپال کی ایک عوامی لائبریری ہے جو عوام اور بالخصوص طلبہ کی بے لوث خدمت انجام دے رہی ہے۔ علامہ اقبال کی یاد میں ۱۹۳۹ء میں قائم اس لائبریری نے درجہ بدرجہ ترقی کی لیکن اب اس کی ترقی میں عمارت کی کمی حائل ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے آپ نے کہا ہمیں امید ہے کہ بوقت ضرورت اراکین لائبریری کو تمام ادب دوست حضرات کا تعاون حاصل رہے گا۔ اس کے بعد حبیب ترنم نے اقبال کی غزل پیش کی اس کے بعد پروفیسر آفاق احمد نے تقریر کی۔ آپ نے بتایا کہ اقبال نے اسلام کو بیدار کیا لیکن مسلمانوں کے نظریہ سے نہیں بلکہ ایک عالمی حیثیت سے اور اس کا ان کو حق بھی تھا۔ ان کا تخاطب کسی ایک فرقہ سے نہیں بلکہ عالم انسانیت سے تھا۔ آخر میں آفاق صاحب نے اراکین لائبریری کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس جلسہ کا انعقاد کر کے اقبال پر مفید تقاریر سننے کا موقع فراہم کیا اس کے بعد یوسف کمال بخاری نے تقریر کی جس میں انھوں نے بتایا کہ اقبال مسلمانوں کا شاعر نہیں تھا بلکہ ایک عالمی شاعر تھا۔ اقبال نے انسانیت کو ایک پیغام دیا، وہ چاہتے تھے کہ انسان ان تمام حدود کو عبور کرے جنہیں عبور کر کے انسان مرد مومن بنتا ہے اس کے بعد ایم عرفان نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال نے بڑی جسارت سے وہ بات کہی جو دوسرے نہ کہہ سکے۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے اقبال کی شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ممنون حسن خاں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ ممنون حسن خاں بھوپال کی وہ شخصیت ہیں جنہیں علامہ کا قرب حاصل رہا ہے آپ آج کل اقبال پر انگریزی میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں کتاب کا ایک باب انھوں نے حاضرین جلسہ کو سنایا مقالات کی اس نشست کے اختتام پر اکھلیش کمار جین نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ بلاشبہ اقبال ایک عظیم شاعر مفکر اور فلسفی تھا کسی شاعر کے خیالات کو ملکی حدود میں نہیں باندھا جا سکتا اگر پاکستان والے اس کے نظریات کو سمجھ کر یہ کہیں کہ اقبال ہمارا شاعر ہے تو انھیں کوئی نہیں روک سکتا جس طرح اگر ہم یہ کہیں کہ ٹیگور ہمارا ہے تو کوئی ہمیں نہیں روک سکتا جس کے بعد شعری نشست کا آغاز کیا گیا جس کی صدارت ممنون حسن خاں صاحب نے فرمائی۔ (نامہ نگار)

کلکتہ میں مرزا غالب پر سیمینار

کلکتہ۔ ایران سوسائٹی ہال میں مرزا غالب پر ہونے والے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر تعلیم مغربی بنگال سنتیہ پریا رائے نے اردو کے مشہور شاعر غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب سب سے بڑے شاعر ہیں اور اردو کے اس بے مثل شاعر کی زبان سے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کو یکساں لگاؤ دلچسپی اور محبت ہے۔ انھوں نے غالب کے کلکتے میں ڈیڑھ سال کے قیام اور کلکتے سے ان کی والہانہ شیفتگی اور وابستگی کا بھی ذکر کیا وزیر تعلیم جناب ستیہ پریا رائے نے یقین دلایا کہ غالب کے سلسلے میں مغربی بنگال میں ہونے والے تمام کام سے ریاستی حکومت تعاون کرنے کو تیار ہے اور غالب کے اشعار کے بنگلہ ترجمے کی اشاعت کی ذمہ داری اور خرچ کا بار اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ بنگلہ روزنامہ اور جلسے کے صدر ڈاکٹر رمیش کمار چیٹرجی نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کی عہد آفریں شاعری کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا ہندوستان کے اس عظیم شاعر نے اردو ادب اور شاعری کو نیا رنگ نئی رعنائی اور نیا آہنگ اور لب و لہجہ عطا کیا اور اردو نثر کو سلاست روانی اور بے ساختگی بخشی۔

انجمن ترقی اردو دلی کا سالانہ اجلاس

دلی ۔ ۲۰ اپریل کو اردو پارک میں انجمن ترقی اردو دلی کا عام جلسہ پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تمام مقررین نے اس پر زور دیا کہ وزارت داخلہ کے ۱۹۵۸ء کے سرکلر میں درج تحفظات کو استعمال کرنے کے لئے دلی میں سرکاری طور پر مزید دلی کارپوریشن اور ایڈمنسٹریشن کو ہدایت کی جائے تاکہ اردو کی ثانوی حیثیت قانونی طور پر دلی میں تسلیم کی جائے۔

اجلاس میں سہ لسانی فارمولے سے متعلق بھی ایک ریزولیوشن منظور ہوا اور ایک اور ریزولیوشن میں اس پر اظہار ناراضگی کیا گیا کہ کارپوریشن نے اپنے ایک منظور شدہ ریزولیوشن کی خلاف ورزی کی ہے اردو کو اب کارپوریشن میں محض ترجمے تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے جب کہ اس کی حیثیت ثانوی تسلیم کی جا چکی ہے۔ پہلا ریزولیوشن جناب مقیم الدین فاروقی نے پیش کیا اور جناب عبد الغنی ڈار ایم پی نے اس کی تائید میں تقریر کی۔ دوسرا ریزولیوشن بیگم انیس قدوائی نے پیش کیا۔ اور جناب سعید احمد آغا ایم۔ پی نے اس کی تائید کی تیسرا ریزولیوشن بہاری لال نے پیش کیا اور مولانا اسحٰق سنبھلی ایم۔ پی نے اس کی تائید کی۔ مقیم الدین فاروقی صاحب نے فرمایا کہ دلی میں اردو کی مخالفت یہاں کی جن سنگھی ہی نے نہیں کی اردو دلی میونسپل کمیٹی نے بھی اردو کے حقوق پر چھاپہ مارا لیکن مرکزی حکومت کی سرد مہری کی وجہ سے دلی میں اردو کا مسئلہ تا حال کھٹائی میں پڑا ہے اور موجودہ دلی ایڈمنسٹریشن اور کارپوریشن کو اس لئے اردو سے ناانصافی کی ہمت ہوئی کہ ارباب اقتدار اردو کو اس کا حق دینا نہیں چاہتے۔

عبد الغنی ڈار صاحب نے فرمایا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو بیرونی ملکوں کو ہندوستان سے قریب کرتی ہے یہ تین ملکوں میں بھی اور بولی جاتی ہے۔ جو لوگ اردو کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس طرح ہندوستان کا رشتہ بیرونی دنیا سے کمزور ہو جائے گا حکومت کی یہ ناانصافی ہے کہ باوجود بار بار انجمن ترقی اردو کی یاد دہانی کے اس طرف توجہ نہیں کرتی اور یہ مسئلہ آزادی ملنے کے کئی سال بعد بھی یوں کا توں ہے حالانکہ جنگ آزادی میں جس زبان نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ اردو ہی ہے۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بنگال میں بھی گونجا اور مدراس میں بھی اردو شاعروں اور ادیبوں نے اپنے شاہکاروں سے عوامی خیالات کو تحریک کے موافق بنایا اور آزادی حاصل کرنے میں اردو کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس پیاری اور ہر دلعزیز زبان کو اب خواہ مخواہ دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ سعید آغا صاحب نے فرمایا کہ ہم کشمیری اپنی زبان کے ساتھ اردو کے ہمدرد اس لئے ہو گئے کہ شمالی ہندوستان سے اردو کو نکالنے کی ہر طرح کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ ہماری مادری زبان یہ نہیں ہے لیکن ہم اردو کو اس لئے سینے سے لگائے ہوئے ہیں کہ اس میں ہمارا تہذیبی اور ثقافتی بیش بہا سرمایہ ہے۔ مولانا اسحٰق سنبھلی صاحب نے فرمایا کہ اردو والوں کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے اور حکومت کی ناانصافی کو ہر جگہ چیلنج کرنا چاہئے۔ اگر ان کا منی آرڈر یا درخواست اردو میں لکھے ہونے کی وجہ سے واپس آئے تو متعلقہ محکمے سے احتجاج کرنا چاہئے اور اپنے طور پر اردو والوں کو اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانی چاہئے۔ محض مالی منفعت کی خاطر خود اردو والے بھی ان دنوں اردو سے تغافل برت رہے ہیں۔ یہ صورت حالات بہت خرابی کا باعث ہوگی۔ ہماری آئندہ نسل اردو سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے اس طرح اردو میں جو ادب کا بیش بہا خزانہ ہے وہ اس سے محروم رہ جائے گی آخر میں مولانا اسحٰق صاحب نے فرمایا کہ میں انجمن ترقی اردو کو عوامی جلسہ کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں پنڈت سندر لال صاحب نے غیر معمولی تقریر کی علاوہ انور صابری نے نظم پیش کی اور سات بجے سے رات کے دس بجے تک یہ اجلاس جاری رہا۔ سامعین میں ممبران انجمن ترقی اردو ادبا شعراء کے علاوہ دلی کے عام شہری بہت بڑی تعداد میں شریک تھے جو ذوق و شوق سے اول سے آخر تک اجلاس کی کارروائی سنتے رہے۔ آخر میں جناب آنند نرائن ملا صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی۔

(جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو دلی)

بنگالی ادیب بھی اردو کے حامی

کلکتہ ۔ راشٹر بھاشا پرچار کلکتہ کی ایک ادبی نشست میں بنگلہ زبان کے مشہور و ممتاز شاعر و ادیب پریمیندر مترا نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا مستقبل شاندار ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو اس کے اصل مقام سے زیادہ دنوں تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ انہوں نے کہا کہ اردو ایک ہمہ گیر اور دل پذیر زبان ہے۔ اس کا جنم ہی مختلف زبانوں کے اختلاط اور مختلف مذہب کی سرپرستی میں ہوا۔ لہٰذا اس زبان میں یہ گن ہے کہ خود اکیلی ہی قومی یکجہتی کو فروغ دے سکتی ہے اس کی سدا بہار شادابی اور ہمہ جہتی ہمیشہ دلوں کو اسیر کئے رہے گی اردو کو سارے شمالی ہندوستان کی زبان ہونا چاہئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسے وہیں جگہ نہ ملی جہاں اس نے آنکھیں کھولیں اور جہاں اس نے نشوونما پائی۔

بزم ادب پورنیہ کالج کا جلسہ

پورنیہ ۔ بزم اردو پورنیہ کالج کے زیر اہتمام اکیسویں سالانہ جلسہ کے موقع پر جشن غالب بڑی شان و شوکت سے ۱۲ اور ۱۳ اپریل کو

جناب عنایت الرحمٰن عنایت ڈسٹرکٹ جج پورنیہ کی صدارت میں منعقد ہوا اس شاندار جشن کا افتتاح جناب سید حسنین صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی نے کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں غالب کی صلاحیت نثر نگاری پر روشنی ڈالی اور اس عظیم شاعر کی فنکارانہ شخصیت کا ایک دوسرا رخ بھرپور طور پر نمایاں کیا۔ یہ ادبی مقالہ خاص طور پر پسند کیا گیا۔

صدر بزم جناب میر فضل امام نے غالب کی صوفیانہ شاعری پر مختصر تقریر کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اور معتمد بزم جناب منظر حسین قیصر نے اپنی رپورٹ میں بزم کی کارگزاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے جشن غالب کے سلسلے میں تمام تقریبات کی مکمل روداد پیش کی۔ جناب ڈاکٹر حسنین نے طلبہ کو انعامات و اسناد تقسیم کیں اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جو ہزاروں کی تعداد میں سامعین کے درمیان خوبصورت پنڈال میں نہایت نظم و ضبط سے کامیاب طور پر ۱۱ بجے شب تک چلتا رہا۔ بہت سے نامور اور ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

جناب صدر عنایت الرحمٰن عنایت نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب اردو کا عظیم شاعر ہے اور اس کے کلام سے اردو شاعری میں ایک نئے ذہن و فکر کے میلانات کا آغاز ہوتا ہے آخر میں انہوں نے بزم اردو کی سرگرمی اور کارگذاری پر اراکین بزم کو مبارکباد پیش کی۔ پھر پرنسپل مدن مصری نے اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس طور پر شاندار جشن کے پہلے روز کا پروگرام ختم ہوا۔

دوسرے روز ۲ بجے شام سے جناب پروفیسر امان اللہ طارق اور جناب مختار احمد عاصی نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ غالب اردو کا بے مثال شاعر ہے پروفیسر طارق نے فرمایا کہ جشن غالب کا اہتمام جس طرح سارے دنیا میں کیا گیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کی شخصیت ایک عظیم عالمی ہیرو کی ہے ان دونوں حضرات نے اپنی غزلیں بھی سنائیں۔ پھر ۳ بجے شام سے پروفیسر طارق جمیل مصنف "آگ اور پانی" کی لکھی ہوئی ایک ٹریجڈی "شکست کی آواز" مصنف کی ہدایت کاری اور طلبا کی اداکاری میں حمیدہ سلطان کے ایک مضمون کی روشنی میں غالب اور ترک پر مبنی یہ ڈرامہ خاص طور پر پسند کیا گیا۔ آخر میں جناب ڈاکٹر حسنین صاحب نے پروفیسر طارق جمیل کو اس کامیاب ڈرامہ کے لئے مبارکباد پیش کی جن طلبا نے اس میں حصہ لیا ان کو کپ اور اسناد عطا کی گئیں۔ (نامہ نگار)

گورکھپور میں انجمن "نئے زاویے" کا قیام

گورکھپور ۲۰ اپریل۔ محمد احسن رضوی کی قیام گاہ پر ایک خصوصی ادبی نشست میں یہاں کے بعض نئے فنکاروں کی انجمن "نئے زاویے" کا قیام عمل میں آیا۔ سرپرست بدری نرائن سرواستو۔ صدر جناب ہندی گورکھپوری سکریٹری ایم کوٹھیاوی راہی اور ناظم نشر و اشاعت محمد احسن رضوی منتخب کئے گئے۔ ممبران خصوصی کی حیثیت سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی (لکھنؤ) اور محبوب الرحمٰن (نائب مدیر "شب خون" الہ آباد) نامزد کئے گئے۔

اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں ادبی جمود کو توڑنا۔ تخلیقی قوتوں کو ابھارنا نئے ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے اس انجمن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اس کی ہر نشست میں پڑھی جانے والی تخلیقات پر کھل کر تبصرہ ہوگا۔

جلسے میں راہی اور محمد احسن رضوی نے نظمیں اور جالب نعمانی نے غزل سنائی۔ بدری نرائن سرواستو نے "ادب کے لئے جدیدیت ناگزیر" کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (نامہ نگار)

پٹیالہ میں جشن "صبوحی"

پٹیالہ۔ سنٹرل پبلک لائبریری پٹیالہ کے لکچر ہال میں زیر صدارت ڈی۔ وملیس راج گپتا ممبر پبلک سروس کمیشن پنجاب انجمن ترقی اردو کی جانب سے جناب مہر چند کوثر کے شعری مجموعہ "صبوحی" کی رسم اجرا کے موقع پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں شہر کے معززین کے علاوہ مقامی اور بیرون جات سے آئے ہوئے نامور شعرا حضرات نے شرکت فرمائی۔ (نامہ نگار)

ادبی "سنگم" کا قیام

دہلی۔ اردو شعر و ادب کی ترویج اور ارتقا کے پیش نظر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک انجمن کا "ادبی سنگم" کے نام سے قیام عمل میں آیا ہے۔ اس کی پہلی نشست جناب محمد سلطان صاحب لیکچرر جمادیات کے مکان پر منعقد ہوئی اس میں جناب انور صدیقی صاحب، جناب انوار علی خاں سوز صاحب، جناب جے پال سنگھ ترنگ صاحب، جناب محمد یوسف صاحب پاپا، جناب ظہور انجم صاحب، جناب سطوت رسول صاحب، جناب رہبر بہرائچوی اور سید منظر بریلی نے شرکت فرمائی اور اپنے تازہ کلام سے محظوظ فرمایا۔ ادبی سنگم کے آئندہ جلسہ کے لئے "نظم" اردو شعرا اور ہندی کویوں سے گزارش ہے کہ وہ لفظوں کی تنہائی کے موضوع پر طبع آزمائی فرمائیں۔

(نامہ نگار)

اردو کو اترپردیش میں ثانوی زبان تسلیم کیا جائے

کلکتہ۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ جناب اجے مکرجی نے غالب سیمینار میں غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب ایک سو سال قبل محبت اور دردمندی کے جذبات کا اظہار انہوں نے دیں کیا ان کی افادیت آج بھی لوگوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی اردو ہندو مسلمان، سکھوں اور عیسائیوں کی زبان رہی ہے اور آج بھی یہ قومی یکجہتی کی ایک بڑی علامت ہے۔ سیمینار میں ایک ریزولیوشن منظور کیا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اردو کو یوپی میں دوسری زبان بنایا جائے

تبصرہ

ریاض الرحمٰن خاں شروانی

تاریخ مصر و عرب قومیت

مصنف :- ڈاکٹر اے کاشیور راؤ

مترجم :- شری پی نرسمہا راؤ

پبلشر :- تلگو اردو اکاڈمی آف سائنس اینڈ ہسٹری حیدرآباد (آندھرا پردیش)

ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت درج نہیں ہے

ہندوستان کے عرب ممالک سے قدیمی سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی تعلقات ہیں جو زمانہ ماقبل اسلام سے موجودہ عہد تک پھیلے ہوئے ہیں ان ممالک میں مصر کو ہمیشہ خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے درمیان میں غیر ملکی تسلط کی بنا پر یہ تعلقات کسی حد تک کمزور ہو گئے تھے لیکن ہندوستان اور مصر کی تحریک آزادی کے دوران مشترک مقصد کی لگن نے ان تعلقات کو حیات تازہ بخشی اگرچہ ان کا دائرہ صرف سیاست تک محدود رہا۔ ہندوستان میں حصول آزادی اور مصر میں جمال عبدالناصر کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان میں پختگی بھی آئی اور ان کا دائرہ وسیع بھی ہوا۔ بالخصوص جواہرلال نہرو اور جمال عبدالناصر کی دوستی نے مثالی حیثیت اختیار کر لی اور یہ دوستی اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہوئی۔ تاہم یہ کمی اکثر محسوس ہوتی ہے کہ ان ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے حالات و مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں، اور اسی لئے غلط فہمیاں پھیلانے والوں کا کام آسان ہو جاتا ہے دوست ممالک کے اندرونی حالات و مسائل سے عوام کو آگاہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو حالات سے واقف بھی ہوں اور اس کی اہمیت کا احساس بھی رکھتے ہوں یہ کام سب سے بہتر طور پر ملکی زبان میں تصنیف و تالیف ہی کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ پیش نظر تصنیف اسی طرح کی ایک کوشش ہے جس کا سہرا تلگو اردو اکاڈمی، حیدرآباد کے سر ہے ڈاکٹر کاشیور راؤ آنجہانی نے یہ کتاب تلگو میں لکھی تھی اور اب اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے کتاب فراعنۂ مصر کے زمانے سے موجودہ دور تک کی تاریخ پر حاوی ہے ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت کی تاریخ کو چند سو صفحات میں محدود کرنا آسان نہیں ہے، اور اس لئے ہم زیر نظر تصنیف کے بارے میں یہ توقع نہیں کر سکتے ہیں کہ اس میں تاریخ کے سب تقاضوں کو پورا کیا گیا ہوگا تاہم اس کے مطالعے سے مصر کی مکمل تاریخ سے عمومی واقفیت ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اور غالباً یہی مصنف کا مقصد بھی تھا۔

عرب قومیت بہت اہم موضوع ہے اور اس کے بارے میں اکثر ذہنوں میں خاصی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں خیال تھا کہ زیر نظر تصنیف میں اس کے بنیادی محرکات، موجودہ مسائل اور آئندہ کے امکانات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس معاملے میں کتاب کے مطالعے سے مایوسی ہوتی ہے۔ اس لئے بہتر تھا کہ کتاب کا نام صرف تاریخ مصر ہوتا اور اس میں عرب قومیت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ ترجمہ بالعموم سلیس اور شگفتہ ہے اگرچہ بعض جگہ الفاظ کا انتخاب کھٹکتا ہے مثلاً صفحہ ۲۲۸ پر بھائی کے بجائے برادر کا استعمال مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید بدیع دہلوی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا